ابو عمار زاہد الراشدی

اجتماعی اجتہاد کی ضرورت اور اس کے تقاضے

"بنوں فقہی کانفرنس" منعقدہ ۱۷' ۱۸ اپریل ۹۶ء کے لیے لکھا گیا

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على جميع الانبياء والمرسلين خصوصا" على خاتم النبيين وآله وصحابه اجمعين

المرکز الاسلامی بنوں کے سربراہ برادرم مولانا سید نصیب علی شاہ صاحب زید مجدہم کا شکرگزار ہوں کہ ان کی عنایت سے "بنوں فقہی کانفرنس" میں اہل علم و فکر کے اس اجتماع کے سامنے کچھ طالب علمانہ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دیں' کانفرنس کو کامیابی سے نوازیں اور کچھ مقصد کی باتیں شرکا کانفرنس کے گوش گزار کرنے کی توفیق عطا فرمائیں' آمین یا الہ العالمین۔

شاہ صاحب موصوف گزشتہ دنوں "بنوں فقہی کانفرنس" میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے اپنے معزز رفقاء کے ہمراہ گوجرانوالہ تشریف لائے تو ان کے پاس کانفرنس میں پیش کیے جانے کے لیے مضامین و مقالات کے مجوزہ عنوانات کی فہرست میں سے ایک عنوان کا میں نے خود انتخاب کیا جو فہرست کے مطابق یوں تھا "تقلید و اجتہاد کی حدود کا تعین اور اجتماعی اجتہاد کے تصور کا علمی جائزہ"

لیکن جب قلم و کاغذ سنبھالے' خیالات کو مجتمع کرنا چاہا تو محسوس ہوا کہ یہ ایک نہیں دو الگ الگ عنوان ہیں اور ہر عنوان اپنی جگہ مستقل گفتگو کا متقاضی ہے' اس لیے ان میں سے ثانی الذکر کا انتخاب کرتے ہوئے اسے "اجتماعی اجتہاد کی ضرورت اور اس کے تقاضے" کی شکل دے کر اس پر کچھ معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں' اور گفتگو کے آغاز سے پہلے ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ گزارشات کسی علمی تحقیق و مطالعہ پر مبنی نہیں ہیں اور نہ ہی خود کو اس کا اہل سمجھتا ہوں بلکہ یہ اس وقت دنیا بھر میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے والی نظریاتی اور تہذیبی کشمکش کی فضا میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کے ایک نظریاتی

کارکن کے احساسات و تاثرات ہیں جو کسی علمی ترتیب کے بغیر آپ حضرات کے سامنے آ رہے ہیں اور انہیں اسی پس منظر میں سماعت فرمانے کی آپ سب بزرگوں سے استدعا ہے۔

معزز شرکاء کانفرنس! اجتہاد احکام شرعیہ کے چار بنیادی ماخذ میں سے ہے جسے قرآن کریم میں لعلمه الذين يستنبطونه منهم کی صورت میں بیان فرمایا گیا ہے اور جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی طرف سے "اجتهد برایی" کے عزم کے اظہار پر ان کی حوصلہ افزائی اور تصویب فرما کر اسے سند توثیق بخشی ہے، پھر یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے مکمل اور ختم ہونے کا ناگزیر تقاضا بھی ہے کہ قیامت تک وحی کے عدم نزول کے دور میں پیش آنے والے واقعات و مسائل کا وحی کے ساتھ رشتہ قائم رکھنے کی کوئی صورت ضرور موجود ہو تا کہ نسل انسانی ان امور میں وحی الٰہی کی راہنمائی سے محروم نہ رہے چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو جانے والی آسمانی وحی اور قیامت تک نسل انسانی کو پیش آنے والے مسائل و مشکلات کے درمیان اسی علمی ارتباط کا نام "اجتہاد" ہے جس کی بدولت اسلام دنیا کے ہر خطے، نسل اور زمانے کے لوگوں کے لیے ایک قابل عمل بلکہ واجب العمل نظام حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

اجتہاد کا یہ عمل جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادات کو چونکہ وحی الٰہی کی تائید یا سکوت کی صورت میں خود وحی الٰہی کا درجہ حاصل ہے اس لیے اصطلاحی معنوں میں اجتہاد کا آغاز حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور سے شمار کیا جاتا ہے جو اس وقت سے مسلسل جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

اجتہاد کے بارے میں ایک بات تسلسل کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ پہلی تین یا چار صدیوں کے بعد اجتہاد کا دروازہ علماء نے بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے بعد سے کوئی مستقل مجتہد سامنے نہیں آ رہا لیکن یہ غلط فہمی علوم وفنون کی تشکیل وتدوین کے مراحل سے بے خبری کا نتیجہ ہے ورنہ اجتہاد کا دروازہ کسی دور میں بند نہیں ہوا اور تمام تر کمزوریوں کے باوجود یہ عمل آج بھی جاری ہے، البتہ اجتہاد کے اصول وقواعد کی ترتیب و تدوین کا باب ضرور بند ہوا ہے اور یہ ایک منطقی اور فطری عمل ہے۔ دنیا میں مختلف علوم و فنون کے آغاز، تشکیل اور ترقی و کمال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایک بات سب میں مشترک نظر آتی

ہے کہ انسانی معاشرہ کی کوئی نہ کوئی ضرورت' مناسبت رکھنے والے ذہن میں داعیہ پیدا کرتی ہے جو رفتہ رفتہ ذوق کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ تک اس ذوق کا انفرادی اظہار ہوتا ہے اور مختلف جہات سے سامنے آنے والا یہ ذوق بتدریج ایک علم اور فن کی صورت اختیار کر جاتا ہے' یہی صورت حال "اجتہاد" کے ساتھ بھی پیش آئی۔ اجتہاد ایک شرعی ضرورت تھی جس نے اجتہادی صلاحیت سے بہرہ ور ذہنوں میں داعیہ پیدا کیا' کچھ عرصہ تک اس ذوق کا انفرادی اظہار ہوتا رہا' اصول وضوابط وضع ہوئے' استنباط و تطبیق کے قواعد ترتیب پائے' مختلف شخصیات کی طرف سے وضع کردہ اصول و قواعد نے توافق وتقابل کے مراحل سے گزرتے ہوئے رفتہ رفتہ ایک باضابطہ علم کی حیثیت اختیار کر لی اور متعدد فقہی مکاتب فکر وجود میں آ گئے۔

اس پس منظر میں "مجتہدین مطلق" یا مستقل مجتہدین جو اجتہاد کے اصول و قواعد وضع کرتے ہیں' ان کے ظہور کا دور وہی تھا جب بنیادی قواعد وضوابط تشکیل پا رہے تھے اور اس دور میں بیسیوں مستقل مجتہدین سامنے آئے اور انہوں نے اپنے فقہی حلقے قائم کیے جن میں سے چار یا ظواہر کو شامل کر کے پانچ مکاتب فکر کو امت نے قبول کر لیا اور باقی فقہی حلقے فطری عمل کے مطابق تاریخ کی نذر ہو گئے۔ اس کے بعد قیامت تک کسی مستقل مجتہد کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اس علم کے بنیادی قواعد وضوابط کی تشکیل وترتیب کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے مثلاً علم نحو کے قواعد و ضوابط کی ترتیب کا ایک دور تھا۔ اس دور میں مختلف ائمہ نے قواعد و ضوابط وضع کیے جو قیامت تک اس علم کی بنیاد بن گئے۔ اب ان بنیادی قواعد و ضوابط کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کی تشریح وتعبیر' ترمیم و اضافہ اور اضافی قواعد کی تدوین کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہے اور ہر باصلاحیت کا حق ہے کہ وہ اس جولانگاہ میں اپنے رہوار فکر کو جہاں تک اس کے بس میں ہو' دوڑاتا چلا جائے لیکن اگر وہ نحو کے بنیادی قواعد مثلاً "الفاعل مرفوع والمفعول منصوب والمضاف الیہ مجرور" کو تبدیل کرنے کی خواہش کا اظہار کرے گا تو کوئی ذی ہوش شخص اسے یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہو گا" اس لیے اگر علوم و فنون کی تشکیل وتدوین کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے بنیادی قوعد و ضوابط کے وضع وتدوین کا باب بند ہوا ہے تو اسے علماء یا فقہاء نے بند نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے فطری عمل اور تاریخ کا تسلسل کار فرما ہے۔

معزز شرکاء محفل ! اصل مسئلہ اجتہاد کے باب کا کھلا ہونا یا بند ہو جانا نہیں بلکہ آج کے دور میں انسانی معاشرہ کو درپیش مسائل اور اجتہادی عمل کے درمیان پائی جانے والی وہ خلیج ہے جو ہر باشعور شخص کو واضح طور پر نظر آ رہی ہے اور ہر شخص اپنے ذوق اور ذہن کے مطابق اس کی تعبیر کر رہا ہے' اس خلیج کا باعث اجتہاد کی بندش نہیں بلکہ اجتہاد کے جاری و ساری عمل کو صحیح طور پر استعمال میں نہ لانا ہے اور میری ناقص طالب علمانہ رائے میں مسائل حاضرہ اور اجتہادی عمل کے درمیان پائی جانے والی خلیج کے اہم اسباب یہ ہیں۔

۱۔ اب سے ایک ہزار سال قبل اسلامی اعتقادات پر یونانی فلسفہ کی یلغار کے دور میں ہمارے علماء نے اس فلسفہ کی ماہیت اور مضرات کا صحیح طور پر بروقت ادراک کر لیا تھا اور اس سے کماحقہ واقفیت حاصل کر کے اسی کی زبان میں اس کے توڑ اور مقابلہ کی فضا پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے یونانی فلسفہ اسلامی اعتقادات پر حملہ میں کامیابی حاصل نہ کر سکا مگر اب سے کم و بیش دو سو برس پہلے سائنسی ایجادات و انکشافات' صنعتی ترقی اور مغرب کے لادینی فلسفہ حیات کی بیک وقت پیش رفت کے موقع پر ہمارے علمی ادارے اس سہ جہتی یلغار کی نوعیت اور نفع و نقصان کا صحیح طور پر اندازہ نہ کر سکے اور رازیؒ' غزالیؒ' ابن رشدؒ اور ابن تیمیہؒ کی طرح مخالف فلسفہ کا برابر کی سطح پر مقابلہ کرنے کی بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کر لی گئی جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے اور مغرب کا فلسفہ لادینیت امت مسلمہ کے مختلف طبقات کے ذہنوں میں غیر شعوری ارتداد کی کمین گاہیں قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے' اگر اس دوران ہمارے علمی ادارے اور دینی مراکز سائنسی علوم' صنعت و حرفت اور مغربی فلسفہ سے واقفیت اور اس کی تعلیم کے دروازے بند نہ کر لیتے اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہی علوم کے ہتھیاروں کو ان سے مقابلہ کے لیے اختیار کرتے تو آج مغرب کا لادینی فلسفہ مسلمانوں کے اعتقادی' نظریاتی' قانونی' معاشرتی اور تہذیبی ڈھانچے کے لیے اس قدر کھلا چیلنج نہ بن پاتا۔

۲۔ کوئی نظام جب تک معاشرہ میں نافذ العمل رہتا ہے' معاشرہ کی بدلتی ہوئی صورت حال پر نظر رکھنا اور نئے پیش آمدہ مسائل اور قانون میں مطابقت پیدا کرتے رہنا قانون اور اس سے متعلق اداروں کی ذمہ داری ہوتا ہے مگر بیشتر مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے تسلط کے دور میں یہ صورت قائم نہ رہ سکی' ان ممالک کے قانون ونظام بدل گئے' قضاء کا منصب افتا کی صورت اختیار کر گیا' اسلامی احکام و قوانین پر عمل کی حیثیت ایک اختیاری

عمل کی سی رہ گئی جس کی وجہ سے معاشرہ کی ضروریات کا جائزہ لینا اور قانون کے ساتھ ان کی تطبیق کی صورتیں پیدا کرنا "قضا" کے علم سے تعلق رکھنے والے افراد اور اداروں کی ذمہ داری نہ رہا بلکہ یہ ذمہ داری عام مسلمان کو منتقل ہو گئی کہ وہ کسی معاملہ میں شرعی حکم معلوم کرنا چاہتا ہے تو کسی مفتی سے دریافت کر لے۔ اس "تنزل" نے احکام و قوانین کی اجتماعیت کا تصور مجروح کر دیا' انفرادیت اور محدود سوچ اجتہادی عمل پر غالب آ گئی اور معاشرہ کے اجتماعی مسائل و مشکلات کو اجتہاد کے ذریعے حل کرنے کا کوئی مربوط نظام باقی نہ رہا۔

۲ - دور غلامی میں دینی مدارس اور ان کے نظام تعلیم کا بنیادی ہدف اسلامی عقائد' دینی علوم اور مسلم معاشرت کا تحفظ تھا جس میں انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور برصغیر میں دینی مدارس کے ہاتھوں فکری اور تہذیبی شکست مغربی فلسفہ کے علمبرداروں کے لیے ابھی تک سوہان روح بنی ہوئی ہے لیکن بنیادی ہدف چونکہ تحفظ تھا اس لیے دینی مدارس کے "نصاب ونظام" کی ترجیحات اسی "تحفظ" کے گرد گھومتی رہیں اور معاشرہ میں شرعی احکام و قوانین کی تطبیق و تنفید ان کے اہداف میں نہیں تھی اور نہ ہی دور غلامی میں اس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا اس لیے فطری طور پر تطبیق و تنفید سے متعلقہ اجتہادی عمل دینی مدارس کی ترجیحات میں جگہ نہ پا سکا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کی غالب اکثریت اجتہاد کی اہمیت و ضرورت' معاشرہ میں اس کے حقیقی کردار اور اس کی صلاحیت و استعداد کے تقاضوں سے یکسر بے خبر ہے۔

اجتہاد کا عمل اس دوران بند نہیں ہوا بلکہ اس کا دائرہ محدود ہو گیا تھا' مختلف مکاتب فکر کے بڑے بڑے دارالافتاء اس دوران جو کام کرتے رہے' اس کا بیشتر حصہ اجتہاد کے زمرہ میں آتا ہے لیکن معاشرہ میں شرعی احکام و قوانین کی تطبیق و تنفید کا عمل اجتہاد کے دائرے میں شامل نہ رہا اور مغربی فلسفہ حیات کی ہمہ جہتی یلغار کا صحیح طور پر ادراک نہ کرتے ہوئے اس کے مقابلہ کے لیے بروقت پیش بندی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی جس کی وجہ سے مسائل حاضرہ اور اجتہادی عمل کے درمیان وہ خلیج نظر آ رہی ہے جس نے صرف اصحاب فکر ونظر کو مسلسل پریشان کر رکھا ہے بلکہ مسلم ممالک بالخصوص پاکستان میں اسلامی نظام کے عملی نفاذ میں ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت بھی اختیار کیے ہوئے ہے۔

حاضرین مکرم! اجتہاد کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے ایک اور سوال کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے اجتہاد کی اہلیت کا مسئلہ جس نے علماء دین اور جدید اہل

دانش کے درمیان باقاعدہ ایک تنازعہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے بعض خطبات کا سہارا لیتے ہوئے ان کے فرزند جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال اور ان کے ساتھ قانون دانوں کا ایک طبقہ یہ موقف اختیار کیے ہوئے ہے کہ علماء کرام چونکہ آج کے علوم وفنون اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مسائل اور ان کے اسباب ونتائج سے براہ راست واقف نہیں ہوتے اس لیے ان میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہے اور اجتہاد کا یہ حق پارلیمنٹ کو منتقل ہو جانا چاہیے جبکہ علماء کرام کا موقف یہ ہے کہ فقہاء نے اجتہاد کے لیے جن علوم کی مہارت کو شرط قرار دیا ہے مثلاً (۱) قرآن کریم (۲) سنت رسولؐ (۳) اجماع امت (۴) اقاویل سلف (۵) علوم عربیت' چونکہ پارلیمنٹ اور دیگر آئینی ادارے ان علوم سے آگاہی نہیں رکھتے' اس لیے ان کے لیے اجتہاد کا حق تسلیم کرنے سے تحریف دین کا دروازہ کھل جائے گا۔

ہماری ناقص رائے میں ان دونوں موقفوں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ اجتہاد کے مسلمہ اصولوں کے مطابق مجتہد کے لیے ماخذ اور محل دونوں کے ساتھ اجتہادی درجہ کی واقفیت ضروری ہے۔ ماخذ سے مراد وہ علوم شرعی ہیں جن سے آگاہی کو فقہاء نے اجتہاد کے لیے شرط ٹھہرایا ہے اور محل سے مراد اس شعبہ زندگی کے مروجہ قواعد وضوابط' روایات اور عرف ہے جس سے متعلق مسئلہ درپیش ہے' ماخذ اور محل سے کماحقہ آگاہی اور ان دونوں کے درمیان تطبیق کی صلاحیت کے تین اجزاء سے اجتہاد کا عمل ترتیب پاتا ہے اور اس اجتماعی تناظر میں دیکھا جائے تو دونوں طبقوں کے موقف میں واقعاتی بنیاد کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہے اور ان میں سے کسی ایک کو یکسر نظرانداز کر دینا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہو گا۔

جدید اہل دانش کا خیال ہے کہ زمانے کے حالات' متعلقہ شعبہ زندگی کے قواعد وروایات اور عرف سے آگاہی اصل ہے جبکہ قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر' احادیث کی شروح وتراجم اور فقہی احکام کے ذخیرے وافر مقدار میں میسر ہونے کی وجہ سے ماخذ سے عدم واقفیت کا خلا کسی حد تک پر کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ مطالعہ کا علم کسی بھی علم کی باقاعدہ تعلیم کا متبادل تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور کسی بھی علم میں لٹریچر کی فراوانی اور عام افراد کی اس تک رسائی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لٹریچر تک رسائی رکھنے والے شخص نے محض اس بنیاد پر اس علم میں اس درجہ کی "مہارت" کی سند

بھی حاصل کر لی ہے جو کسی بھی علم میں اجتہادی عمل کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے، آج ملک میں بہت سے افراد مل جائیں گے جن کا آئین و قانون کا مطالعہ اور ان کی تشریح کی صلاحیت متوسط درجہ کے وکلاء سے زیادہ ہے لیکن ملک کی کوئی عدالت ایسے شخص کو کسی آئینی اور قانونی معاملہ میں رائے کا باقاعدہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہو گی۔ یہ اصول اور ضابطہ کی بات ہے، جس سے کسی شعبہ زندگی میں انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری طرف علماء کرام کا یہ طرز عمل بھی محل نظر ہے کہ محل سے ناواقفیت یعنی متعلقہ مسئلہ کے مالہ وما علیہ اور اس کے حوالہ سے مروجہ عرف و روایات سے عدم آگاہی کے خلا کو متعلقہ شعبہ کے کچھ افراد سے پوچھ گچھ کی صورت میں پر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور حالات زمانہ اور مروجہ عرف وروایات سے اس درجہ کی "عملی ممارست" کو ضروری نہیں سمجھا جا رہا جو کسی زمانے میں ہمارے فقہا کا طرہ امتیاز ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر عبادات میں لاؤڈ اسپیکر کے جواز اور عدم جواز کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے جس میں طویل بحث و مباحثہ کے بعد کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنے میں ہمیں کم و بیش ربع صدی کا وقت لگا اور اگر اس کے اسباب کا تجزیہ کریں گے تو سب سے بڑا سبب وہی لاؤڈ اسپیکر کے تکنیکی معاملات سے "عملی ممارست" کا فقدان قرار پائے گا جس نے ہمیں ربع صدی تک تکنیکی بحث میں الجھائے رکھا۔

اس کے ساتھ مسئلہ کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ علماء کرام کے لیے زندگی کے تمام شعبوں کے ساتھ اس درجہ کی "عملی ممارست" کو شرط قرار دینا اور انہیں اس کے لیے مجبور کرنا بجائے خود محل نظر ہے، یہ "تخصصات" کا دور ہے۔ ماخذ کے اعتبار سے سب علوم شرعیہ پر یکساں مہارت رکھنے والے حضرات کا ملنا ہی مشکل ہوتا جا رہا ہے اور اگر محل کے لحاظ سے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے اطوار و عرف سے واقفیت کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو بات اور زیادہ پیچیدہ ہو جائے گی، قدیم فقہاء نے ماخذ کے لحاظ سے تو "تجزی فی الاجتہاد" کے عنوان سے اس کا حل پیش کیا تھا کہ ایک شخص ایک شعبہ میں اجتہاد کی اہلیت سے بہرہ ور ہے اور دوسرے شعبہ میں نہیں ہے تو یہ صورت جمہور فقہاء کے نزدیک قابل قبول ہے اور اگر "تجزی فی الاجتہاد" کو محل کے نقطہ نظر سے بھی تسلیم کر لیا جائے تو معاملات میں توسع اور تنوع کا دائرہ پھیلتا چلا جائے گا۔

حضرات محترم! اصحاب فکر و نظر نے اس مشکل کا حل "اجتماعی اجتہاد" کی صورت میں

تجویز کیا ہے اور یہ کوئی نئی تجویز نہیں ہے بلکہ امام اعظم ابو حنیفہ ؒ کے طرز اجتہاد کا احیاء ہے جس میں فقہاء اور ماہرین کی ایک بڑی جماعت مشاورت اور اجتماعی بحث و مباحثہ کی صورت میں مسائل کے استنباط و استخراج کی مراحل کو تکمیل تک پہنچاتی تھی اور اسی "اجتماعی اجتہاد" کے ذریعے مستنبط ہونے والے احکام و مسائل فقہ حنفی کا بنیادی ذخیرہ ہیں اس لیے آج ضرورت اس امر کی ہے کہ امام اعظم ؒ کے طرز اجتہاد کو زندہ کرتے ہوئے اہل علم اور ماہرین کی ایک ایسی کونسل قائم کی جائے جو نہ صرف یہ کہ غیر سرکاری ہو بلکہ اقتدار کی کشمکش اور گروہی سیاست کی ترجیحات سے بے نیاز اور بالاتر ہو۔ اس میں دینی علوم کے مختلف شعبوں کے چوٹی کے ماہرین کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں سے عملی تعلق رکھنے والے تجربہ کار ماہرین کو بھی شریک کیا جائے اور باہمی بحث و تمحیص اور اجتماعی مشاورت کے ذریعے مسائل حاضرہ کا حل تلاش کیا جائے۔

آخر میں مسئلہ کے ایک اور پہلو کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور جہاں علم اور فن کے لحاظ سے تخصصات میں تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر رہا ہے' وہاں معاشرت کے تخصصات و امتیازات دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں' انسانی معاشرہ نیشنلزم کا حصار توڑ کر انٹر نیشنل ازم کی طرف عازم سفر ہے' فاصلے سمٹتے جا رہے ہیں اور انسانی زندگی تیزی کے ساتھ ایک مشترک بین الاقوامی معاشرت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان حالات میں ہمیں اجتہاد کی اہلیت کی شرائط میں (۱) ماخذ سے آگاہی (۲) محل سے واقفیت اور (۳) تطبیق کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ (۴) بین الاقوامی رجحانات سے شناسائی کی شرط کا اضافہ بھی کرنا ہو گا اور اجتماعی معاملات میں بین الاقوامی امور کے ماہرین کے علم و تجربہ سے استفادہ کرنا ہو گا کیونکہ اسی صورت میں ہم مستقبل کے انسانی معاشرہ اور اجتہاد کے اسلامی اصول کے درمیان وہ حقیقی رشتہ جوڑ سکیں گے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کا پہلے سے زیادہ احساس دلا رہا ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین